pISSN:0000-0000
eISSN:0000-0000

CC BY

OPEN ACCESS

اردو ادب اور جدید طرزِ حیات

URDU LITERATURE AND MODERN LIFESTYLE

ڈاکٹر عرفان احسن پاشا

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، فیصل آباد

Dr. Irfan Ahsan Pasha
Assistant Professor, Dept. of Urdu, University of Education, Faisalabad Campus

Abstract

Modern lifestyle is the biggest outcome of our times. As a social phenomenon it is much due to the developmentof the Human society. Advancement in knowledge laid the foundation of scienceand technology and this advancement transformed the ancient simple life to themagic world of today where everything is on your single click. Modern life hasmany problems too. The cause of these problems is also the same advancement intechnology. In todays globalized world these problems are at large and encompassthe whole world. Urdu literature does not ignore these pros and cons of modernlifestyle in its depiction. This article shows the presentation of modernlifestyle in modern Urdu literature at aglance.

عالم گیریت کا سب سے اہم مظہر وہ جدید طرز حیات ہے جو دنیا بھر کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ موجود ہے۔ جدید طرز حیات میں بہت سے یکساں پہلو ہیں جن میں کسی معاشرے اور کسی ملک کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ ایک جیسی اشیا کے استعمال اور ایک جیسے نظریات کے پرچار سے ایک ایسا گلوبل معاشرہ وجود میں آیا ہے جس نے قومیتوں، قبیلوں اور ممالک کے درمیان خوراک، لباس، رہائش، اور زندگی کے دیگر طور طریقوں کے ساتھ ساتھ نظریات اور سوچ کے واضح سماجی فرق کو بڑی حد تک تلپٹ کر دیا ہے۔ جدید طرز حیات میں جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت آرام اور آسائش کی انتہا ہے اور حضرت انسان دنیاوی ترقی کے

لحاظ سے تاریخ کے عظیم ترین دور سے گزر رہا ہے وہیں پر اسی ترقی کی وجہ سے بہت سے مسائل کا بھی سامنا کر رہا ہے جس کی وجہ سے خود اس کرہ ارض پر زندگی کو متعدد خطرات لاحق ہیں۔

یہ درست ہے کہ بالادست اور معاشی طور پر ترقی یافتہ ممالک ہی اس نظام کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اسی وجہ سے ان کا اثر جدید زندگی پر بہت زیادہ ہے۔ دور حاضر کی واحد سپر پاور امریکہ ہے جو روسی سوویت یونین کے انہدام کی وجہ سے دنیا میں آزاد جمہوری معاشرے کا داعی اور علم بردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی معاشرت کا اثر جدید زندگی پر سب سے زیادہ ہے۔ اس بات کا اظہار جدید ادب میں بھی کیا جارہا ہے جو عالم گیریت کے زیر اثر دنیا بھر میں لکھا جارہا ہے۔ اردو ادب میں جدید معاشرت سے مراد عمومی طور پر امریکی طرز حیات ہی ہے۔ بانو قدسیہ اپنے ناول "حاصل گھاٹ" میں لکھتی ہیں:

> "امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔ امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں، ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے۔"۱

جدید طرز حیات کا اندازہ ان ضائع شدہ اور استعمال شدہ اشیا کی باقیات سے ہوتا ہے جو کوڑادانوں کی نذر ہوتی ہیں۔ کوڑادانوں میں پڑی اشیا سے گھروں میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں ان کا پتا چلتا ہے کیونکہ ان کے پیکٹ، ریپر، ڈبے وغیرہ ان کے استعمال کی نشان دہی کرتے ہیں۔ دنیا کے سبھی بڑے شہروں میں یہ غلاظت تقریباً ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی ناول "خس وخاشاک زمانے" میں لکھتے ہیں:

> "نیویارک شہر کی ساری گندگی، غلاظت اور ثقافت اپنے کاندھوں پر لادتے ہوئے انعام اللہ نے اپنے آپ سے سوال کیا.. خالی ڈبے.. بوتلیں، کارٹن،.. پیزا کے بوسیدہ ہو چکے ٹکڑے.. غلیظ چیتھڑے.. اخبار.. بچوں کے ڈائپر...اس شہر کی ثروت اور گناہوں کا سارا بوجھ.. یہ کیسا رزق ہے"۲

یہ جدید طرز حیات انسانوں کے درمیان ربط کو کمزور سے کمزور کرتا چلا جارہا ہے۔ اس وجہ سے ان میں انسیت اور اپنائیت کا جذبہ معدوم ہوتا جارہا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے لیے اکساتا ہے۔ اس کساد بازاری نے لوگوں میں اجنبیت اور مغائرت پیدا کی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے حساس لوگ منشیات اور بے گھری کا شکار ہو کر گھومتے ہیں اور ان کو کوئی سنبھالا دینے والا نہیں ہے۔ جدید بڑے شہر بہت بے رحم ہوتے ہیں وہ کسی کو پناہ دینے کے لیے رضامند نہیں ہوتے:

"اس کے سر پر کوئی چھت نہ تھی.. جونہی رات ہوتی وہ کبھی کسی پل کے نیچے.. بروک لین کے پل کے تلے.. شہر کے پسماندہ حصوں کے فٹ پاتھوں پر جہاں پولیس کا آنا جانا کم ہوتا تھا.. سنٹرل پارک کے کسی بنچ پر.. اور کبھی کبھار وہ پوری رات چلتے پھرتے گزار دیتا اور کہیں بھی پناہ نہ ملتی.. اور ان پلوں کے نیچے فلائی اوورز کی چھتوں تلے.. کسی جنک یارڈ میں وہ تنہا نہ ہوتا اس جیسے اور بھی بے آسرا لوگ ہوتے، نشے میں چہرے سرخ کیے، آگ تاپتے.. منشیات کے مارے ہوئے.. سدا کے الکوحل میں ڈوبے ہوئے.."۳

یہاں تک کہ اب تو قریبی عزیز اور رشتہ دار بھی آڑے وقت میں آپ سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ خاص طور پر مغربی معاشرے میں تو لوگ اپنے مہمان کو بھی اذیت سمجھتے ہیں:

"میں تمہیں دو چار روز کے لیے تو اپنے پاس جگہ دے سکتا ہوں اور وہ بھی غسل خانے میں جس کے فرش پر تمہارے لیے ایک سلیپنگ بیگ بچھا دیا جائے گا.. اس کے سوا میں اور تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا.."٤

کیونکہ خود ان کے اپنے پاس بھی اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ کسی دوسرے انسان کا بوجھ سہار سکیں۔

"ایک مختصر سے بے ترتیب فلیٹ میں جو ان ضخیم کتابوں کے بوجھ سے مسمار ہو سکتا تھا جو عہد گزشتہ میں دانشوری اور سرخ سویرے کی آمد آمد کی سند تھیں.. کارل مارکس، اینگلز، لینن، یہاں تک کہ مرتد ٹراٹسکی کے مکمل درجنوں جلدوں پر محیط مجموعے... روسی، چیک اور تیسری دنیا کی نمائندہ ادبی تحریریں اور ناول۔۔۔۔۔"٥

جدید زندگی کی عمارت مشہور برانڈز پر کھڑی ہے۔ ان برانڈز کی بین الاقوامی زنجیر کروڑوں ڈالر کماتی ہیں اور اسی حساب سے خرچ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہیں جن کی وجہ سے مقامی منڈی ان کی اجارہ داری میں آجاتی ہے اور وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ عالمی سطح پر مشہور برانڈز ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں اور اب تو لوگ Brand Conscious ہونا قابل فخر سمجھتے ہیں۔ ادب میں بھی عالمی برانڈز اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ نیر اقبال علوی "سوسائٹی مین" میں رقم طراز ہیں:

"پروقار شخصیت والے آدمی نے "بربری" کا سوٹ، جس میں کافی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں، ٹائی کے بغیر زیب تن کر رکھا تھا۔ شرٹ کے کھلے گریبان سے کارٹئیر (Cartier) کی طلائی چین، کلائی پر

پاٹک فلپ(Patik Phillip) کی بیش قیمت گھڑی، ٹیفنی کے کف لنکس اور آنکھوں پر رے بین
کی عینک اس کے متمول ہونے کی غمازی کر رہے تھے"٦

اس طرح فلومار کیٹ "میں لکھتے ہیں:

"مجید کی نظر کپڑوں سے لدے ہوئے ہینگروں پر پڑی جن میں ارمانی، باس، ور ساچے، اور ٹونی ہل فگر
جیسے بڑے بڑے ڈیزائنوں کے کپڑے ٹنگے تھے"(فلومار کیٹ)٧

مستنصر حسین تارڑ نے "خس و خاشاک زمانے "میں رالف لارین کا ذکر کیا ہے:

"گاؤں کی اس مہنگی ترین سٹریٹ میں رالف لارین والوں کو بھی اپنے شوروم کے لیے جگہ حاصل
نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود کہ وہ لاکھوں ڈالر کی پیشگی ادائیگی کرنے کے لیے تیار تھے"٨

جدید طرز حیات کا ایک ڈریس کوڈ ہے جو دنیا بھر میں ایگزیکٹوز کی پہچان ہے اور ان کو دیکھ کر کوئی بھی آدمی ان کے ملبوس سے ان کی وطنیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ تارڑ نے اس ڈریس کوڈ کو اپنے ناول "خس و خاشاک زمانے "میں یوں بیان کیا ہے:

"ایک معزز نیویار کر.. سیاہ سوٹ، سرمئی ٹائی اور سیاہ ہیٹ میں، ہاتھ میں ایک بریف کیس، جوتے
پالش سے دمکتے ہوئے"٩

جدید دنیا میں ترقی کا معیار ایجادات ہیں۔ کوئی قوم خواہ اس کا ماضی کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو جب تک ایجادات کی دوڑ میں اپنے آپ کو آگے لانے اور دیگر اقوام سے مسابقت پیدا نہیں کرے گی اس وقت تک وہ جدید طرز حیات سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی ۔ مسلمانوں کا بھی یہی المیہ ہے کہ وہ ایجادات کی دوڑ میں شامل ہونے کی بجائے غیبی مدد کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہی۔ تارڑ کے بقول:

"جس نے پچھلے پانچ سو برس سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہیں کیا تھا اور محض آسمانی امداد کے طلب
گار اپنے رب کے آگے سجدے کرتے گڑ گڑاتے .. اے رب ان کفار کو نیست و نابود کر دے کی
دعائیں مانگتے رہتے تھے.. لیکن ادھر سے.. آسمانوں سے، غیب کے فرشتوں نے کہاں اترنا تھا۔۔۔۔..
ٹیکنالوجی نے ان کے پر جلا دیئے تھے"١٠

عطیہ سید اپنے افسانوں میں زیادہ تر اٹلی کی تہذیب و ثقافت کو پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو بھی آشکار کیا ہے۔ "فریب آرزو "میں اس جدید معاشرت کے لباس کی صورت حال یوں بیان کرتے ہیں:

"وہ یکدم اٹھی، پھٹی ہوئی میکسی کو تن سے جدا کیا، نیلی جینز، نیلی پیلی دھاریوں والی کرتی پہنی اور روم کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے نکل پڑی۔ ۱۱

اقبال متین نے "شہر آشوب" میں بڑے، جدید اور صنعتی شہروں میں گاڑیوں اور آٹو موبائیل کی جدید صورت کی تصویر کشی یوں کی ہے:

"کیسی گہما گہمی تھی۔ ساری سڑکیں لگتا تھا، ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی ہیں۔ حالاں کہ سڑکیں جوں کی توں شہر بھر میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر دوڑتی ہوئی موٹریں، بسیں، آٹو، اسکوٹریں، سائیکلیں اس طرح دوڑتی تھیں کہ سڑک نظر نہ آتی تھی۔" ۱۲

جدید ترین طرز حیات میں اس قدر تیزی سے تبدیلی کا عمل رونما ہو رہا ہے کہ لگتا ہے جیسے انسان کسی تیز رفتار گاڑی میں بیٹھا ہو جہاں بہت تیزی سے مناظر بدلتے جاتے ہیں اور لگتا ہے کہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں دیکھا۔ نیر اقبال علوی اپنے افسانے "خواہش" میں اسی صورت حال کو بیان کرتے ہیں:

"انسان طویل سفر کرنے کے بعد بڑے فخر سے اکیسویں صدی میں داخل ہو گیا ہے، لیکن۔۔۔ اس کی آنکھیں ابھی مکمل طور پر نہیں کھل سکیں۔۔۔۔۔۔ شاید کرہ ارض کو اچھی اور صاف نگاہوں سے دیکھنے کے لیے انسان کو مزید چند صدیاں درکار ہوں گی۔" ۱۳

غازیہ شاہد جدید زندگی کی صرف اشیا کے بارے میں ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ ان کا اسلوب اور زبان بھی جدید ہے جو انگریزی الفاظ سے مزین ہے جو ان کے بیان میں بھی جدت کا مظہر ہے۔ "ایک تھی چڑیا" میں لکھتی ہیں:

"کہاں سے سنتی ہو ایسی اوٹ پٹانگ کہانیاں؟

ماں نے بالوں میں لگے رولر ٹائٹ کرتے ہوئے پوچھا

ماما! رضیہ سناتی ہے یہ کہانی مجھے اچھی لگتی ہے

بچی نے ماں کے گالوں پر Kiss کرتے ہوئے بتایا۔" ۱۴

جس جدید طرز زندگی کو عالمی تناظر میں ہمارے لوگوں اور بالخصوص اوپری طبقے نے اختیار کیا ہے اس سے ہماری روایات اور قدیم اقدار ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ "ایک تھی چڑیا" کا یہ اقتباس اس کی عکاسی کے لیے کافی ہے:

"یہ بزنس پارٹی بھی بہت عجیب ہے یہاں سب کی بیویاں ساجھی ہوتی ہیں۔بیک ورڈ لوگوں کی طرح ان میں عزت، غیرت، آن نہیں ہوتی یہاں عورت صرف عورت ہوتی ہے، سجی سنوری نازواداد کھاتی۔اس کے ہنسنے بولنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔اور جب شوہر کا بزنس پارٹنر کسی عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالے Low Neck کے سلیولیس ڈریس میں آدھی ڈھکی عورت کو لیے پارٹی سے باہر چلا جائے تو کوئی اعتراض نہیں کرتا۔"۱۵

نیر اقبال علوی ایک طرف جدید معاشرے میں مسابقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کے زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے جدید معاشرت کے انعام یعنی ڈپریشن اور فرسٹریشن کی بات کرتے ہیں جس کا حوالہ انہوں نے "ٹوٹا ہوا کھلونا" میں یوں دیا ہے:

"ہنسنے اور خوش رہنے کے زمانے تو کب کے لد گئے۔اس زمانے کے انسانی چہروں پر تو رونا سجتا ہے، کیوں کہ جدھر دیکھو، ڈپریشن اور فریسٹریشن کے موسم چھائے رہتے ہیں"۱۶

اور دوسری طرف زیادہ جوان اور پرکشش نظر آنے کے لیے اور دوڑتی ہوئی زندگی کی لگام تھامنے کے لیے کی جانے والی تگ ودو کا بھی ذکر کرتے ہیں جو خواتین میں خصوصاً اور مردوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔جدید طرز زندگی میں انسانی ترجیحات بدل گئی ہیں لیکن توقعات وہی ہیں جن کی وجہ سے اکثر قدیم اور جدید نسل میں تناؤ رہتا ہے۔اس کا ذکر نیر اقبال علوی نے "انتقام" میں یوں کیا ہے:

"صبوحی شہریار، انیس سالہ یاسمین کی چالیس سالہ ماں ہی نہ تھی، بلکہ ماں کا رول نبھانے سے زیادہ اس کو اپنے لیڈیز گارمنٹس کی فیشن ایبل بوتیک بھی بہت عزیز تھی جس کی جڑوں میں جوان وخوب رو بدن کی ان تھک محنت کی کھاد اور گھریلو زندگی کو اگنور کرتے ہوئے بے شمار قیمتی وقت اس پودے کی نگہبانی وآبیاری میں صرف کر کے اس کو تن آور درخت کا روپ عطا کیا تھا۔"۱۷

محمد حمید شاہد نے "رکی ہوئی زندگی" میں دور جدید میں سب سے زیادہ تیزی سے پروان چڑھنے والی کاسمیٹکس انڈسٹری کو یوں موضوع بنایا ہے:

"سارا کمرہ، امپورٹیڈ باڈی لوشنز اور پرفیومز سے مہکنے لگتا۔اسی مہک میں کپڑوں کی سرسراہٹیں جاگتیں، ویکسنگ اور پفنگ کے بعد بلش آن اور کاسمیٹکس کے انتخاب میں ایک مدت گزر جاتی۔"۱۸

جدید طرز حیات جدید نظریات سے عبارت ہے اور آج کل سب سے رواں نظریہ بین المذاہب ہم آہنگی کا ہے جسے مبین مرزا نے "سفید پھولوں کے اس طرف" میں یوں پیش کیا ہے:

"سارے مذاہب انسان سے محبت کا درس دیتے ہیں، اس لیے کسی بھی مذہب کو اختیار کیا جاسکتا ہے" ۱۹

جدید زندگی کی سب سے نمایاں ظاہری حالت لباس ہے۔ عالم گیریت کے تحت لباس نا صرف یکسانیت اختیار کر رہا ہے بلکہ اس میں جدت بھی آ رہی ہے اور یہ جدت بعض اوقات نہایت مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ کیوں کہ لباس کی تراش خراش کا اب کوئی معین فارمولہ نہیں رہا۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "نیویارک کے سو رنگ" میں لکھتے ہیں:

"لباس بھی کوئی ایک نہ تھا۔۔ جس کے جی میں جو آیا وہ اس نے پہن لیا تھا۔۔ اگر جی میں نہیں آیا تو صرف وہاں وہاں پہنا تھا جہاں جہاں مجبوری تھی" ۔۲۰

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مرزا اطہر بیگ لباس کی اس پیش کش میں مختلف تہذیبوں اور ان کے انداز نظر کو بھی پیش کرتے ہیں۔ "صفر سے ایک تک" میں اسی کشاکش کو یوں بیان کیا ہے:

"والدہ کے پاس بیٹھ گیا اچانک ان کے منہ سے چیخ سی نکلی انہوں نے مری آگے پیچھے سے بری طرح گھسی ہوئی جین دیکھ لی تھی۔ اور پھر جو آہ وزاری انہوں نے شروع کی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری حالت اتنی تباہ ہو چکی ہے کہ "لیریں" پہننے پر مجبور ہو چکا ہوں۔ بہنیں ہنستی تھیں کہ بہر حال وہ اس انوکھے مغربی فیشن کو سمجھتی تھیں" ۲۱

اردو کے جدید نثر نگاروں نے جدید طرز حیات کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا اور مقامی اور بین الاقوامی طرز حیات میں آنے والی تبدیلیوں اور ان کے مظاہر بلکہ دیگر ملکوں اور معاشروں کے طرز حیات کے ساتھ آویزش کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس طرح عالم گیریت کا یہ پہلو بھی اردو ادب کا ایک بڑا حصہ بن گیا ہے۔

سائنسی شعور نے لوگوں کو بہت خود آگاہی دی ہے جس سے توہمات کا خاتمہ ہوا ہے ۔ آج دنیا بھر میں سائنسی معلومات، ایجادات اور دریافتیں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آفرین تبدیلیاں لا رہی ہیں۔ جہاں یہ جدید ترین سائنسی معلومات اور سہولیات نہیں پہنچی وہاں لوگوں کو بعض جدید مظاہر کو سمجھنے یا قبول کرنے میں تردد ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں شعر و ادب میں بھی سائنسی شعور کو کامیابی کے ساتھ پیش کی جارہا ہے اور اردو ادب بھی اس سے مبرا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے افسانوں میں ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن کا تعلق سائنسی شعور کے ساتھ جا ملتا ہے۔ مثلاً نیر اقبال علوی نے اپنے افسانے "دھند" مشمولہ مجموعہ 'جہان رنگ و بو' میں خاوند کی

وفات کے چار سال بعد اس کے منجمد نطفے سے ماں بننے والی بیرون ملک مقیم عورت کو موضوع بنایا ہے جس کے پاکستان میں رہنے والے سسرال والے مشرق میں سائنس کی اس ایجاد کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں اور وہ اس بچے کی پیدائش کو اس عورت کی آوارگی پر محمول کر کے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اسی طرح جینز میں لائی جانے والی تبدیلیوں کے حوالے سے محمد مظہر الزماں خاں اپنے افسانے "دستاویز" میں رقم طراز ہیں:

"نصاب اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ شہروں اور ملکوں بلکہ نطفوں کی شکلیں تک بدلی جا رہی ہیں۔"۲۲

سجاد تبسم نے عورت اور مرد کے حیاتیاتی مرکزے کے اجزا یعنی کروموسومز کی بحث کو افسانے میں نہایت خوب صورتی سے سمو دیا ہے جس نے عورت کی خامی اور کوتاہی کے عمومی خیال کی تکذیب کر دی ہے۔ سائنس بچے کی جنس یعنی مذکر یا مونث ہونے کی ذمہ داری مرد پر ڈالتی ہے جب کہ ہمارے معاشرے میں عموماً عورت کو قصوروار ٹھہرا کر مار پیٹ، طلاق، سوتن یا بعض اوقات قتل کی صورت میں ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ لیکن سجاد تبسم نے اس مہین فرق کو نہایت سائنسی انداز میں یوں واکیا ہے:

"مرد وزن کے کروموسومز تو برابر ہیں لیکن ایک باریک فرق کروموسوم کی شکل کا ہے۔ مرد میں ایکس وائی "xy" جب کہ عورت میں ایکس ایکس "xx" کروموسومز پائے جاتے ہیں۔ مرد کا ایک کروموسوم "y" کمزور ےادوسرے معنی میں مکمل نہیں ہوتا جبکہ عورت کے تمام کروموسوم مکمل ہوتے ہیں۔"۲۳

جب کہ منیر الدین منیر "موروثی مرض" میں بتاتے ہیں کہ ڈی این اے ٹیسٹ سے بچے کی اصل ولدیت جاننا اب معمولی بات ہے:

"دوسرے بیٹے کی پیدائش پر پتہ چلا کہ اسے ایک موروثی مرض لاحق ہے، جس کے بارے میں گو نتھر جانتا تھا کہ وہ اس کے خاندان میں نہیں اس نے چاروں کا DNA ٹسٹ کرایا تو کھلا کہ دونو بچے گو نتھر کے تخم سے نہ تھے۔"۲٤

جہاں جدید علوم وفنون نے انسان کو اس قدر باریک بینی عطا کی ہے وہیں اس کو وقت کے دھارے اور خلائے بسیط میں دور تک دیکھنے کا ملکہ بھی عطا کیا ہے۔ جو کائنات کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ اس حوالے سے سب سے اہم اور مقبول سائنسی نظریہ "بگ بینگ" یا عظیم دھماکے کا ہے۔ محمد شاہد حمید اسے بھی اردو افسانے کی سلطنت میں لے آئے ہیں:

> "زندگی کی حقیقت جاننے کے جتن کرنے والے کچھ لوگ پہلے پہل کائنات کو ٹھہرا ہوا اور جامد قرار دیتے رہے مگر بہت جلد مردود ٹھہرے کہ بگ بینگ کے نظریے نے جامد کائنات والی جامد فکر کے پرخچے اڑا دیے تھے۔"۲۵

دوسری طرف کائنات کے خاتمے کا نظریہ بلیک ہول ہے جس کا منفی بار اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے اندر جو بھی چیز جائے گی اپنا وجود ختم کر دے گی۔ "یہ گھر" میں رشید امجد اس خالص سائنسی نظریے کو بھی افسانے میں سمونے میں کامیاب ہو گئے ہیں:

> "کبوتر اڑا جا رہا ہے اور لحہ بہ لحہ ایک بلیک ہول کے قریب ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کی اڑان میں ایک ایسی مستی اور جلال ہے کہ وہ بلیک ہول کی کشش میں آنے کی بجائے اپنا الگ رخ اختیار کر رہا ہے۔"۲۶

جدید علوم فنون کا سپر سٹرکچر ہی وہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے جس کی بدولت عالم گیریت کا عمل ممکن ہو سکا ہے اور جس کی وجہ سے کرہ ارض کے فاصلے مٹ گئے ہیں اور اس کی وجہ سے لوگوں کو ایک دوسرے سے شناسائی اور ایک دوسرے تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔ ہر علم شاخ در شاخ تقسیم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس طرح ہر شعبے میں تخصیص یا سپیشلائزیشن کا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الموضوعاتی مطالعہ (Inter-Disciplinary Study) نے ہر آدمی کے لیے تمام علوم کی شدھ بدھ کو ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا اب ایک لکھاری محض لکھاری ہی نہیں بلکہ اسے معاشیات، نفسیات ، بشریات، سماجیات، سیاسیات، میڈیکل سائنسز، خلائی تحقیقات، سمندری مخلوقات ، جغرافیہ تاریخ اور تمام علوم جدیدہ سے کماحقہ آگاہ ہونا چاہیے۔ جب وہ کوئی تحریر لکھے تو جہاں جس علم کی ضرورت پڑے اسے مناسب طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ یہی بنیادی شرط قاری پر بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی جدید علوم وفنون اور ان کی اصطلاحات سے واقفیت حاصل کرے تاکہ اسے جدید دور میں لکھے جانے والے ادب کی تفہیم ہو سکے کیوں کہ عالم گیر معاشرے میں عالم گیر روایات کی ماتحت عالم گیر علوم کا استعمال ادب میں بہت بڑھ گیا ہے۔ اردو فکشن میں بھی جدید علوم وفنون اور ان کی اصطلاحات کے استعمال

کی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں۔ نیر اقبال علوی نے اپنے افسانے "ٹوٹا ہوا کھلونا" میں طب کی جدید ٹیکنالوجی اور اس کے اصطلاحات کا ذکر یوں کیا ہے:

"لفافہ کھولا تو آٹھ سال قبل کار کے حادثے میں شدید زخمی ہونے والی صائمہ کے سر کا سی۔ ٹی۔ سکین، کمپیوٹر ٹوموگرافی اور ڈاکٹری رپورٹ تھی جس میں نیوروسرجن نے حادثے کے بعد مریض کی مجموعی شخصیت میں آنے والی تبدیلی، اس کے رویے کے بدلنے کے آثار اور مستقبل میں ذہن پر مرتب ہونے والے غیر صحت مندانہ اثرات کی نشاندہی کی تھی۔"۲۷

مجید سلیم "پیاسا سمندر" میں علم نفسیات اور جدید دنیا کی عام بیماری یعنی فرسٹریشن کا ذکر کرتے ہیں:

"سیدھے انسانوں کی نفسیات رہی ہے کہ وہ Frustration کا بوجھ کسی ہمدرد کے سامنے اُگل دیتے ہیں۔"۲۸

فیصل عجمی نے اپنے افسانے "آفرینش" میں انسان کے دھوئیں میں تحلیل ہو جانے کے سائنسی نظریے I.H.C. کو یوں بیان کیا ہے:

"سب کچھ ممکن ہے ۔ نیل! یہ دنیا پراسرار چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ جیسے I.H.C یعنی Instant Human Combustion۔ اس میں تو انسان ہڈیوں سمیت کسی اندرونی بے پایاں آگ سے دھوئیں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔"۲۹

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرنامے "نیویارک کے سورنگ" میں بھی سائنسی نظریات کو داخل کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کی اساس پھر بھی مذاہب کے مقدس صحیفوں میں ہی جا نکلتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"وہ اپنی مقدس کتاب میں سے دنیا کی ہر سچائی.. ہر انسانی ایجاد.. جدید ترین سائنس کے کمالات.. یہاں تک کہ تھیوری آف ریلیٹیوٹی اور ایٹم بم اور جینز کی تھیوری کی واضح نشانیاں بھی دریافت کر کے نہایت فخر سے اعلان کرتا ہے کہ یہ سب کچھ جو آج جانا گیا ہے اور آئندہ صدیوں میں جانا جائے گا وہ تو ہزاروں برس پیشتر لکھا جا چکا ہے۔"۳۱

ادب میں سائنسی نظریات صرف بیان ہی نہیں کئے گئے۔ بعض اوقات ان کے تشریح و تعبیر اور کئی صورتوں میں تکذیب بھی کی گئی ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جولیس سیزر کو اس کی ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا تھ ااس لیے اس آپریشن کا نام "سیزرین آپریشن" رکھا گیا لیکن سلمیٰ اعوان اپنے سفر نامے "مصر میرا خواب" اس غلط فہمی کی قلعی یوں کھولتی ہیں:

"جولیس کے بارے میں ایک غلط بات کا ازالہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کا پہلا سیزیرین بچہ تھا۔ وہ خود نہیں بلکہ اس کا یہ قانون Lax Cesareo یعنی Law of Cesareo تھا کہ صحت مند بچے کو ماں کا پیٹ چاک کر کے نکال لیا جائے۔ اس عمل میں ماں مرتی ہے مر جائے، بچہ زندہ رہنا چاہیے"۳۲

سائنسی نظریات، ایجادات اور دریافتیں صرف ہماری روز مرہ زندگی کا حصہ ہی نہیں بنیں بلکہ ان کا اظہار دنیا بھر کے ادب میں "سائنس فکشن" کی صورت میں بھی کیا گیا ہے اور عمومی فکشن میں بھی۔ اردو ادب میں بھی ان کی کمی نہیں یہی وجہ ہے کہ اردو ادب ان سائنسی موضوعات کی وجہ سے عالمی ادب سے مربوط نظر آتا ہے۔ آج جب ہم اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے اردو ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب نے جدید سماجی زندگی اور جدید طرز حیات کے مسائل کو، خواہ وہ ہمارے معاشرے کے ہوں یا دیگر معاشروں کے ہوں، بڑی خوبصورتی، ایمانداری اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

١۔ بانو قدسیہ؛ ٢٠٠٤ئ؛ حاصل گھاٹ؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ص١٢٤،١٢٣

٢۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٣٦

٣۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٣٦

٤۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٣٣

٥۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٣٣

٦۔ نیر اقبال علوی؛؛ عالم سوزوساز؛ لاہور؛ ملٹی میڈیاافیئرز؛ ٢٠٠٥؛ ص٨٣

٧۔ نیر اقبال علوی؛؛ عالم سوزوساز؛ لاہور؛ ملٹی میڈیاافیئرز؛ ٢٠٠٥؛ ص٦٥

٨۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٥٣

٩۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٤٥٩

١٠۔ مستنصر حسین تارڑ؛ خس وخاشاک زمانے؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٥٠٤

١١۔ عطیہ سید؛ حکایات جنوں؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠٠١؛ ص١٢٧

١٢۔ رشید درانی، یٰسین احمد، مرتبین؛ ہر ذرہ ستارہ ہے؛ دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس؛ ٢٠٠٦؛ ص٦٩۔٧٠

١٣۔ نیر اقبال علوی؛ جہان رنگ وبو؛ لاہور؛ ملٹی میڈیاافیئرز؛ ٢٠٠٥؛ ص٧٦

١٤۔ غازیہ شاہد؛ گھن لگے دریچے؛ لاہور؛ اظہار سنز؛ ٢٠٠٨؛ ص٢٧

١٥۔ غازیہ شاہد؛ گھن لگے دریچے؛ لاہور؛ اظہار سنز؛ ٢٠٠٨؛ ص٣١

١٦۔ نیر اقبال علوی؛ سلسلہ روزوشب؛ لاہور؛ ملٹی میڈیاافیئرز؛ ٢٠٠٥؛ ص٢١

١٧۔ نیر اقبال علوی؛ سلسلہ روزوشب؛ لاہور؛ ملٹی میڈیاافیئرز؛ ٢٠٠٥؛ ص٧١

١٨۔ محمد حمید شاہد؛ مرگ زار؛ کراچی؛ اکادمی بازیافت؛ ٢٠٠٤؛ ص٣٣

١٩۔ مبین مرزا؛ خوف کے آسمان تلے؛ کراچی؛ اکادمی بازیافت؛ ٢٠٠٤؛ ص١٥٩

٢٠۔ مستنصر حسین تارڑ؛ نیویارک کے سورنگ؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ٢٠١٠؛ ص٥٤

٢١۔ مرزااطہر بیگ؛ صفر سے ایک تک؛ لاہور؛ سانجھ پبلی کیشنز؛ ٢٠٠٩؛ ص٢٠٤

٢٢۔ رشید درانی، یٰسین احمد، مرتبین؛ ہر ذرہ ستارہ ہے؛ دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس؛ ٢٠٠٦؛ ص٣٢١

٢٣۔ سجاد تبسم؛ لوتھڑا؛ لاہور؛ خزینہ علم وادب؛ ٢٠٠٢؛ ١٠١

٢٤۔ منیر الدین احمد؛ لافانی عشق اور دوسرے افسانے؛ لاہور؛ قوسین؛ ٢٠٠٨؛ ص٩٥

٢٥۔ محمد حمید شاہد؛ مرگ زار؛ کراچی؛ اکادمی بازیافت؛ ٢٠٠٤؛ ص١٢١

٢٦۔ رشید امجد؛ عام آدمی کے خواب؛ اسلام آباد؛ پورب اکادمی؛ ٢٠٠٧؛ ص٧٣٠

۲۷۔ نیر اقبال علوی؛ سلسلہ روزوشب؛ لاہور؛ ملٹی میڈیا افیئرز؛ ۲۰۰۵؛ ص۲۵

۲۸۔ رشید درانی، یٰسین احمد، مرتبین؛ ہر ذرہ ستارہ ہے؛ دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس؛ ۲۰۰۶؛ ص۲۷۷

۲۹۔ فیصل عجمی؛ سونامی؛ اسلام آباد؛ آثار اکادمی؛ ۲۰۰۹؛ ص۲۰۶

۳۱۔ مستنصر حسین تارڑ؛ نیویارک کے سورنگ؛ لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ۲۰۱۰؛ ص۲۹۸-۲۹۹

۳۲۔ سلمٰی اعوان؛ مصر میرا خواب؛ اسلام آباد؛ دوست پبلی کیشنز؛ ۲۰۰۸؛ ص۱۷۸